عہدِ وفا اور وفائے عہد

سُورَۃ الفَتح

آیات ۔ ۸۔۱۰

خُرّم مُرادؔ

منشُورات

00060 / 13

جملہ حقوق محفوظ

عہدِ وفا اور وفائے عہد   از   خرم مرادؒ

جنوری ۱۹۹۸ء _ تعداد: ۲۰۰۰ _ کوڈ: 00060 _ **قیمت**: ۱۳ روپے

ناشر: **منشُورات**، منصورہ، لاہور۔ ۵۴۷۹۰ _ **مطبع**: جے کیو پریس، بند روڈ، لاہور۔

فون: 35252211 _ فیکس: 042-35252210 _ ای میل: manshurat@gmail.com

پیش لفظ

دل کی زندگی ہو یا اُمت کی زندگی، قرآن مجید سے وابستہ ہے۔ صرف وہی صحیح راستہ بتاتا ہے، نور بخشتا ہے، شفا عطا کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی ہمارے لیے دنیا میں ترقی و سربلندی کا کوئی نسخہ کیمیا ہے تو وہ قرآنِ مجید ہے۔ آخرت میں نجات کی کوئی سبیل ہے تو قرآنِ حکیم میں ہے۔ آج بھی مسلمان پر قرآن کا وہی حق ہے جو چودہ سو سال پہلے تھا: اسے سنیں اور سنائیں، سمجھیں اور سمجھائیں، عمل کریں اور عمل کی طرف بلائیں، اس کو غالب کرنے کے لیے جہاد کریں۔ آج بھی قرآن ان کو وہی کچھ عطا کرے گا، جو چودہ سو سال پیشتر کیا تھا: دلوں کی نرمی اور گداز، آنکھوں میں نمی اور بصیرت، علم و حکمت کے گوہر تاب دار، زندگی بسر کرنے کا سیدھا، آسان اور روشن راستہ، زمین میں علو و خلافت، آخرت میں مغفرت اور جنت۔

اس بات کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ میرے پاس نہ وہ علم ہے نہ تقویٰ اور نہ عملِ بالقرآن، کہ میں درسِ قرآن کا منصب سنبھالنے کی جسارت کروں۔ نہ یہ کہ جو کچھ بھی کہا ہے، اسے کتابی صورت میں شائع کروں۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ میرے اوپر فرض ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی نعمت جتنی بھی عطا کی ہے، میں اسے سناؤں، بیان کروں، اور اس کی طرف بلاؤں۔ اس لیے کہ جس نے کتاب دی ہے، اس نے یہ عہد بھی لیا ہے کہ تم اسے بیان کرو گے۔ اور جو عہد کو وفا نہ کریں اور اس کتاب کو چھپا کر بیٹھ جائیں، انھیں اس نے اپنی، فرشتوں کی، اور سارے انسانوں کی لعنت کی وعید سنائی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ کَانَ آیَۃً اللہ کے عہد کے ایفا، اور اسی ارشادِ نبوی ﷺ کی تعمیل ہی میں، یہ جرأت کرتا ہوں کہ، اپنے علم و دانست کی حد تک، قرآن کا پیغام سناؤں۔ اسی کوشش کا نتیجہ یہ درس ہے جو پیش خدمت ہے۔ اُمید ہے اس قسم کے دروس کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

ان دروس میں آپ صَرف ونحو کی گتھیاں نہیں پائیں گے، نہ شانِ نزول کی روایات، نہ فقہ وکلام کے مسائل ومباحث، نہ منطقی استدلال، ان کا مقصد صرف ابلاغِ پیغام اور تذکیر ہے، دلوں کی زندگی کا سامان اور دعوتِ عمل ہے۔ کم علمی اور کم مائیگی کے باوجود وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ (القمر ۵۴:۱۷) پر یقین اس کی بنیاد ہے۔ دل کی صدا یہی ہے۔ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ. (القمر ۵۴:۱۷)

زندگی عہد وامانت کا نام ہے۔ اس کا ہر کام عہد پر قائم ہے، عہد پر چلتا ہے۔ اخلاقی فضائل میں سب سے افضل، عہد ہے۔ زندگی کی درستگی وآراستگی اور اس کا حسن وجمال عہد وامانت کے دم سے ہے۔ ایمان بھی ایک عہد ہے۔ اس عہد ایمان و بندگی کا ایک پہلو وہ عہد ہے جو امت مسلمہ اور اس کے ربّ کے درمیان ہے جو امانتِ وحی کا حق ادا کرنے کے لیے دعوت و جہاد کا عہد ہے۔ امت اپنے اس عہد کو وفا کرے تو اللہ اس سے اپنا عہد وفا کرے گا۔ امت عہد فراموشی اور نقضِ عہد پر کاربند ہوجائے، تو وہ اللہ کی طرف سے لعنت، ذلت، بے چارگی اور غضب کی مستحق ٹھہرتی ہے۔

سورۃ فتح کی ان چند آیات میں اسی عہد وفا کو وفا کرنے کا پیغام ہے۔ میں نے اس کتابچے میں ان آیات کا یہی پیغامِ وفا آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے، میری کسی بات کو میرے خلاف حجت نہ بنائے۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (الصف ۶۱:۲) کے زُمرہ میں شامل ہونے سے مجھے بچائے۔ میرے لیے اصل حاصل قارئین کی داد وتحسین نہیں، بلکہ عنداللہ قبولیت ہے، جس کا ایک ذریعہ آپ کا عمل اور میرے لیے آپ کی دعا ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ اگر آپ اس تحریر کو اپنے لیے نافع پائیں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ میرا خاتمہ ایمان پر کرے اور مجھے اپنی مغفرت سے ڈھانپ لے۔

لاہور — خرم مراد

۷/رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ

۱۸/فروری ۱۹۹۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آیئے! قرآن مجید کی تلاوت، اس کے معانی اور پیغام پر غور و فکر، اور اس کے پیغام سے روشنی حاصل کرنے کا آغاز نبی کریم ﷺ کی اس بشارت کے ساتھ کریں کہ جب لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، اور اس کو باہم سمجھنے اور سمجھانے میں لگ جاتے ہیں، تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے، رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے، اور فرشتے اُن پر آسمان تک سایہ فگن ہو جاتے ہیں۔ (مسلم: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ)۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو نبی رحمت ﷺ کی اس بشارت کا مستحق بنائے اور ٹھہرائے۔

میں بہت سوچتا رہا کہ آج کے دن کے لیے قرآن مجید کے کس حصّے کو قرآن کا پیغام آپ تک پہنچانے کے لیے منتخب کروں۔ خیال آیا کہ یہ تلاش کروں کہ اس قرآن میں خاص طور پر ہمارا ذکر کہاں کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: **فیہ ذکرکم**، اس میں تمھارا ذکر ہے۔ گویا کہ اس میں ہمارے لیے یاد دہانی اور تذکیر کا جو سامان ہے، وہ کہیں ہمارے حوالے سے بھی ہے۔ اس میں ہمارے بارے میں وہ بیان کیا گیا ہے جو ہمارے لیے جاننا ضروری ہے۔ اس لیے ہمارے اس قافلۂ حق کو دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں اس کا ذکر کہاں کیا گیا ہے، اور ہمیں اس ذکر سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیے۔

ہمارا یہ قافلہ، قافلۂ ایمان و جہاد ہے۔ اس قافلے نے جس عزم کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا تھا وہ یہ تھا کہ ہم اپنی زندگیوں میں، اور اللہ کی زمین پر، اللہ کی اور صرف اللہ کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے جدوجہد کریں گے، اور اس کام کے لیے اپنا سب کچھ لگا دیں گے۔ یعنی وہ عظیم کام جو اللہ تعالیٰ کے رسول اور نبی انجام دیتے رہے ہیں، وہ کام کرنے کی ذمہ داری ہم نے اٹھائی تھی۔ ہم نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ ہمارا یہ عزم اور ہمارا یہ عہد اپنے نفس کی خاطر نہیں،

کسی انسان سے نہیں، کسی جماعت سے نہیں، کسی عارضی مدت کے لیے نہیں، بلکہ خدائے وحدہ، لاشریک سے ہے، رضائے الٰہی کے لیے ہے، اور اس وقت تک کے لیے ہے جب تک جسم میں جان ہے۔ ہم نے اللہ رب العالمین کو حاضر و ناظر جان کر اور اس کو گواہ بنا کر یہ عہدِ وفا باندھا تھا، اور وفائے عہد کی راہ پر قدم رکھا تھا۔ اپنے اس عہد اور وفائے عہد کے حوالے سے، میری نگاہیں سورۃ الفتح کی چند آیات پر ٹھہر گئیں، اور دل اس بات پر جم گیا کہ آج انھی آیات کی تلاوت و ترجمانی آپ کے سامنے پیش کروں:

اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا o لِّتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُعَزِّرُوۡهُ وَتُوَقِّرُوۡهُ ؕ وَتُسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا o اِنَّ الَّذِيۡنَ يُبَايِعُوۡنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوۡنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَيۡدِيۡهِمۡ ۚ فَمَنۡ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنۡكُثُ عَلٰى نَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ اَوۡفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيۡهُ اللّٰهَ فَسَيُؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا o (الفتح ۴۸:۸-۱۰)

اے نبی ﷺ، ہم نے تم کو گواہی دینے والا، بشارت دینے والا، اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، تاکہ اے لوگو، تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاؤ، اور اس کا ساتھ دو، اس کی توقیر کرو اور صبح و شام (اللہ کی) تسبیح میں لگے رہو۔

(اے نبی ﷺ) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ اب جو شخص اس عہد کو توڑ دے اس کے عہد توڑنے کا وبال اسی پر پڑے گا۔ اور جو اس عہد کو وفا کرے جو اس نے اللہ سے کیا ہے، اللہ جلد اس کو بہت بڑا بدلہ دے گا۔

ان آیات میں ہمارے عہد وفا کا ذکر ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اس عہد کی حقیقت کیا ہے، یہ عہد کتنا عظیم عہد ہے، اور اس عہد کے تقاضے کتنے نازک اور گراں بار ہیں۔ یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اس عہد کے باندھنے والوں پر کیا ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ وفائے عہد کی راہ کیا ہے، اس راہ کے نقوش اور منزلیں کیا ہیں، بے وفائی کا وبال کیا ہے، اور وفا کا اجر کتنا عظیم ہے...... یہ سب کچھ بتا دیا گیا ہے۔

خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے، لیکن ظاہر ہے کہ مخاطب تو دراصل پوری امت مسلمہ ہے۔ اس کے اول بھی اور آخر بھی، وہ جو اس وقت سامنے تھے، اور وہ جو آج اس امت میں شامل ہیں۔ خاص طور پر مخاطب امت کا وہ گروہ ہے جس نے اس بات کا عہد کیا ہو کہ وہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نصرت، اور دینِ حق کی سربلندی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر رہا ہے، اور اس مقصد کے لیے مرنے اور لڑنے کو تیار ہے۔ ہمارے اقرار کی رُو سے ہم ایک ایسا ہی گروہ ہیں۔ ہمارا اجتماعی وجود صرف ایفائے عہد کے شعور، اس کے ساتھ وابستگی، اور وفائے عہد کی آرزو اور عزم سے عبارت ہے، اسی مرکز پر قائم ہے، اور اسی محور پر گھومتا ہے۔

بات ذرا آگے بڑھایئے! پوری اُمتِ مسلمہ کا وجود، ہر مسلمان کا وجود، پوری انسانیت اور ہر انسان کا وجود، عہد اور ایفائے عہد پر مبنی ہے۔ عہد بندگی وفا کرو، عہد ایمان وفا کرو، یہی ہے خلاصہ تمام انبیاء علیہم السلام اور رسل علیہم السلام کی دعوت کا۔

لہٰذا، ان آیات میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے، سمجھ لیجیے اللہ تعالیٰ ہم ہی سے کہہ رہا ہے۔

عہدِ رسالت

فرمایا:

اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا. (الفتح ۴۸: ۴)

(اے نبی ﷺ) ہم نے بھیجا ہے تم کو (بنا کر)

گواہی دینے والا، اور

بشارت دینے والا، اور

خبردار کردینے والا۔

الفاظ صرف تین ہیں: شاہد، مبشر اور نذیر۔ لیکن بڑے جامع الفاظ ہیں۔ ان الفاظ میں رسالت کے بالکل بنیادی اور لازمی فرائض کو سمیٹ دیا گیا ہے۔ یہی وہ کام ہیں جن کی ادائیگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور نبی بھیجے۔ کام کی نوعیت واضح ہوگئی، تو کام کی اہمیّت بھی

کھل کر سامنے آ گئی۔ پیغام بھی عیاں ہو گیا، اور اس کی خصوصیات بھی روشن ہو گئیں۔

اب جو لوگ کارِ رسالت کی انجام دہی کے نازک مقام پر آ کر کھڑے ہوئے ہیں، ان کا کام ہے کہ وہ دیکھیں کہ اس آیت میں ان کے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے، ان کو اس کا جواب کیا اور کس طرح دینا ہے؟

شہادت

شاہد کے معنی ہیں گواہی دینے والا۔ یہ لفظ صبح و شام ہمارا وظیفہ و کلام ہے۔ اس کے معانی و مفہُوم سے ہم نا آشنا نہیں ہیں۔ گواہی دینے والا حقیقت کا علم رکھتا ہے، ایسا علم جو یقینی ہو اور ہر قسم کے ظن وتخمین اور ریب و تردد سے پاک ہو۔ گواہ کے لیے سب سے پہلے حق کا علم اور اس پر یقین ضروری ہے۔ یہی گواہی کی بنیاد ہے اور اس کی صحت وسچّائی کی ضامن۔

حق کا سب سے بڑا تقاضا ہے یہ ہے کہ اس کو ظاہر و آشکار کیا جائے۔ حق کی گواہی کوئی باہر سے عائد کی جانے والی اور سر تھوپے جانے والی ذمے داری نہیں۔ حق کے علم کا بیج اندر ہو اور وہ پھوٹ کر باہر نہ نکلے، یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک ننھے منے بیج کی فطرت میں بھی یہ قوت واستعداد اور تقاضا پوشیدہ ہوتا ہے کہ وہ زمین کا سینہ چیر کر باہر نکلے، ایک تناور درخت بنے، اس کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہوں، اور ہر لحمہ ثمر بار ہو۔ حق کی فطرت بھی یہی ہے، حق کا تقاضے بھی یہی ہے۔ گواہ کے لیے، یقینی علم کے بعد، حق کی اسی فطرت اور اسی تقاضے کی تکمیل کے لیے گواہی کے کٹہرے میں کھڑا ہو جانا ضروری ہے تاکہ حق بھی ایک تناور درخت بن کر پھلے اور پھولے۔

گواہی کس چیز کی؟

یہ بات یہاں کہی نہیں گئی، لیکن نہ کہنے ہی میں سب کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ گویا جو مجہول ہے، وہ درحقیقت اتنا معروف ہے کہ اس کا بیان کرنا کلام کا عیب ہوتا، وہ اتنا ظاہر ومعلوم ہے کہ اس کا نہ جاننا ممکن نہیں ہے۔ نبی ﷺ اس عظیم واقعہ کا گواہ ہوتا ہے۔ جب اللّٰہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اپنی ہدایت اس کے پاس بھیجی۔ وہ اس حق، ہدایت اور دعوت پر گواہ ہوتا ہے جو اس کے

رب کی طرف سے اس کے سپرد کی گئی ہے، جو انسان کو اس دنیا میں فلاح تک پہنچانے کی، اور آنے والی دنیا میں خوف وحزن سے سلامتی اور فوز مبین کی ضمانت دیتی ہے۔

گواہی کس کے سامنے؟

یہاں اس کا بھی تذکرہ نہیں۔لیکن گواہی کسی کے سامنے ہی ہوتی ہے، اور اس کے سامنے ہوتی ہے جو اس گواہی پر فیصلہ کرنے کا مجاز ومختار ہو۔ یہ اختیار نوع انسانی کے ہر فرد کو حاصل ہے کہ وہ اپنے لیے اس راہ کا انتخاب کرے جو فوز وفلاح تک پہنچاتی ہو۔اس گواہی کا محتاج ہر انسان ہے۔ جو علم زندگی کے معنی ومفہُوم کی خبر دیتا ہو، کائنات اور انسان کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہو، جو آگے اور پیچھے کا پتہ دیتا ہو، اس علم سے کون مستغنی ہوسکتا ہے۔اس کی ضرورت ہر ایک کو ہے، اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنا ہر ایک کی ذمہ داری ہے۔

اس لیے گواہی ہے تو سارے انسانوں کے لیے ہے، علی الناس ہے۔اس میں اپنے اور پرائے کی، کالے اور گورے کی، عربی اور عجمی کی کوئی تفریق نہیں ہوسکتی۔

یہی شہادتِ حق بنیاد ہے امتحان، ہدایت اور جزا وسزا کے اس نظام کی جو اللّٰہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے۔ جزا وسزا کا جواز اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب امتحان منصفانہ ہو۔ امتحان اسی وقت منصفانہ ہوسکتا ہے جب فیصلہ کرنے والے کے سامنے صحیح گواہی موجود ہو۔

غور کیجیے تو شہادت جامع ہے بہت سارے دیگر کاموں کی۔ یا یوں کہیے کہ اور کئی کام ایسے ہیں کہ وہ ہوں تو شہادت مکمل ہوگی۔ مثلاً اللّٰہ کا کلمہ بلند ہو، دین قائم ہو، دین غالب ہو، اسلامی نظام بروئے عمل آئے، اسلامی ریاست وجود پذیر ہو، تب ہی شہادتِ حق مکمل ہوگی۔ لیکن جتنی گواہی دینا ممکن ہو اتنی گواہی دے دینا تو ناگزیر ہے۔

تبشیر وانذار

شہادت کے بعد تبشیر وانذار کے کاموں کا ذکر ہے۔ نبی ﷺ کے لیے مبشر (بشارت دینے والا) اور نذیر (خبردار کرنے والا) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں پہلو شہادت

کی طرح اہم ہیں۔شہادت کی تشریح وتوضیح بھی ہیں، اوراس کی ادائیگی کے لیے ناگزیر بھی۔

یہ کیوں اہم ہیں؟ شہادتِ حق کے کام میں ان کا مقام کیا ہے؟

جزاوسزا کا وعدہ اور خبر، حق ہی کا ایک حصّہ ہے۔جس طرح حق کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کو آشکار کیا جائے، اسی طرح حق کا دامن پکڑنے والوں کو ان کے جزاوانعام کی بشارت اور حق سے منہ موڑنے والوں کو سزاوعذاب کی خبر شہادتِ حق کا ایک حصّہ بھی ہے، اس بشارت وخبر کا اپنا حق بھی ہے، اور مستحقین بشارت وانداز کا حق بھی۔

لیکن بات اس سے زیادہ ہے۔گواہی فیصلے کا تقاضا کرتی ہے۔حق کی گواہی برائے گواہی نہیں، یہ تو دعوتِ عمل ہے۔وہ دعوت جو دلوں اور نگاہوں کو ایک متعین منزل پر جمادے، اوراس منزل تک پہنچ جانے کی آرزو اور امنگ پیدا کرے۔یہ یقین پیدا کرے کہ اس گواہی کو سچ مان کر اس کے حق میں فیصلہ دے دیا تو اخروی اور ابدی نجات اور انعامات سے سرفراز ہوں گے۔نری گواہی دلوں اور جسموں اور معاشروں میں ہل چل نہیں مچاسکتی، جب تک اس کے ساتھ بشارت موجود نہ ہو۔بشارت اس بات کی کہ حق کے لیے عمل صالح اور قول سدید، حق کی محبت، حق کے ساتھ دل کی لگن، اور حق پر استقامت، یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بدلے میں تابناک مستقبل اور بے حدوحساب اجر اور انعامات محفوظ کردیے گئے ہیں۔مستقبل کی تمنائیں اور آرزوئیں، جو یقین سے معمور ہوں، دلوں میں عزم کی شمعیں روشن کرتی ہیں، اوراس عزم کو سدابہار رکھتی ہیں۔

بشارت کی طرح قلوب کی اکساہٹ کے لیے انذار بھی ضروری ہے۔انسان امید اور خوف کے سہارے ہی بڑی بڑی منزلیں پالیتا ہے۔اپنے برے اعمال کے نتائج اور عواقب سے آگہی اور ان پر یقین ہی سے ایسی قوت پیدا ہوتی ہے کہ، جس طرح ہاتھ خودبخود آگ سے کھنچ کر واپس لوٹ آتا ہے اسی طرح، زبان اس بات کے کہنے سے رک جاتی ہے جو اس کے لیے ایک دہکتا ہوا انگارا ہو، قدم اس راہ پر چلنے سے باز آجاتے ہیں جو شعلوں اور دھوئیں کی راہ ہو، ہاتھ وہ لقمہ منہ میں ڈالنے سے اجتناب کرتے ہیں جو پیٹ کے لیے آگ ہو، قومیں ان راہوں پر چلنے سے بچتی ہیں جن کا انجام ہلاکت ہو۔

انذار میں ایک مفہوم اور بھی شامل ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان پر اس کی نجی زندگی اور معاشرے کی خرابیاں واضح کر دی جائیں، اور ان کے عواقب سے وہ آگاہ ہو جائے۔ ایسے عواقب جو دنیا سے لے کر آخرت تک محیط ہیں۔ فرد اور معاشرے پر تنقید کے ذریعے اس میں یہ احساس اور شعور پیدا ہو کہ اس کے اپنے نفس، اپنی جماعت، اور اپنے معاشرے میں کون کون سی خامیاں اور خرابیاں ہیں، جو اس دنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی، خطرناک اور تباہ کن نتائج پیدا کر سکتی ہیں۔

گویا انذار سے جہاں ایک طرف نفس، معاشرہ اور اجتماعیت پر تنقید ہوتی ہے اور ان کی عکاسی ہوتی ہے، وہاں دوسری جانب دل کی کشتی خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پر لنگر ڈال دیتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے نفس کا جائزہ لے کر، زندگی کی موجوں میں اپنی منزل کی طرف آگے بڑھتی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انذار، تبشیر کے ساتھ، عمل صالح کی دوسری بنیاد بن جاتا ہے۔ لہٰذا کارِ رسالت کو انجام دینے کے عہد کو وفا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے نفس میں امید اور خوف رچ بس جائیں، اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری دعوت اور ہمارے پیغام میں انذار و تبشیر کا وہی مقام اور حصّہ ہو انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں تھا۔ دعوت میں انذار تبشیر کے حصّہ اور مقام کا کامل ترین نمونہ خود قرآن مجید ہے۔

کیا ہماری دعوت اس لحاظ سے مکمل ہے؟ یہ اہم سوال ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں۔ کیا ہماری دعوت میں، قول اور عمل میں، جنت اور دوزخ کا مقام اور تناسب وہی ہے جو قرآن مجید میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی زندگیوں میں تھا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ صرف مجرد اصولی دعوت ہی ہماری دعوت بن کر رہ گئی ہو، اور وہ ان دونوں پہلوؤں سے خالی ہو۔

عہد ایمان و نصرت

آگے فرمایا:

لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (الفتح ۴۸: ۹)

تا کہ تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر، اور اس کی تعظیم و توقیر کرو۔

یہ ہے شہادت اور انذار و تبشیر کا مقصد۔ دل اعتماد اور یقین کے ساتھ بھر جائیں۔ زندگیاں پیدا کرنے والے کے حوالے ہو جائیں، جسم و جان سے خدا، اس کے رسول ﷺ اور اس کے دین کی مدد اور غلبے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ ایمان اور خدا اور اس کے رسول ﷺ کی نصرت کا بیان صرف ایک عہد کا بیان نہیں ہے، صرف مقصد اور نتیجے کے طور پر نہیں ہے۔ غور کیجیے تو اس میں دعوت اور پکار ہے کہ ایمان لاؤ اور نصرت کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ۔ یہی عہد وفا کو نباہ لے جانے کی راہ ہے۔

یہاں اس دعوت کا مخاطب کون ہے؟

کسی نے کہا یہ خطاب صرف مسلمانوں کے لیے ہے۔ کسی نے اس میں نبی کریم ﷺ کو شامل سمجھا ہے۔ یہ اختلاف بتاتا ہے کہ اکثر تفسیری نکات کے اختلاف راہِ عمل کے تقاضے نباہنے کے لیے کچھ ضروری نہیں ہوتے۔ ہمارے نزدیک ان دونوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ اللہ کا نبی ﷺ جس ایمان کی دعوت دیتا ہے، خود بھی اس ایمان سے معمور ہوتا ہے۔ وہ جس راہ پر چلنے کے لیے بلاتا ہے، اس راہ پر خود بھی گامزن ہوتا ہے۔ وہ اول المومنین اور اول المسلمین ہوتا ہے۔ سب سے پہلے، سب سے آگے، سب سے بہتر، اور سب کے لیے نمونہ۔

اہم بات یہ ہے کہ ایمان کی دعوت کے معنی کیا ہیں؟ ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ ایمان کے معنی تو یقین اور اعتماد کے ہیں۔ لیکن یہاں ایمان کے فوراً بعد، ساتھ دینے اور توقیر کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس ذکر کرنے ایمان کی حقیقت کو کھول دیا ہے۔ گویا کہ شجر ایمان کے سب سے اہم برگ و بار یہی ہیں، یہی ایمان کی حقیقت کو آشکار کرتے ہیں۔ انھی دو الفاظ میں ایمان کے لازمی اور فوری تقاضوں اور مطالبات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

لیکن مدد اور توقیر کس کی؟ اللہ تعالیٰ کی؟ رسول اللہ ﷺ کی؟ یا دونوں کی؟ اس آیت میں ''اس'' کی ضمیر کا مرجع کیا ہے، اس پر علماء کرام نے بہت سی باتیں کہی ہیں۔ اس مقام کی لغوی اور علمی نزاکتیں یقیناً بہت ہو سکتی ہیں، مگر ایسے مقام پر ایک سالکِ راہِ قرآن کا گوہرِ

مطلوب کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ وہ فنی اور علمی نزاکتوں میں پڑنے کے بجائے یہ دیکھتا ہے کہ دعوت و پیغام کیا ہے؟ عمل کون سا مطلوب ہے؟ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ ضمیر کا مرجع جو کچھ بھی ہو، یہ بہرحال واضح ہے کہ یہاں اللہ کی ذات مراد نہیں، نہ رسول کی بلکہ ان کے دین کی، اور، اس پر مزید، ایمان و عمل کا عہدِ وفا باندھنے والوں کی بھی، مدد اور توقیر مراد ہے۔

بات واضح ہو جائے گی اگر ہم یہ دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں نصرت کی دعوت دی ہے، مختلف انداز میں دی ہے۔ بعض مقامات پر دعوت کو خاص اپنے نام کے ساتھ مخصوص فرمایا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ (الصف ۶۱: ۱۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے مددگار رہو جاؤ۔

پھر کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے نام کو اپنے نام کے ساتھ جوڑ کر ذکر فرمایا:

وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ (الحدید ۵۷: ۲۵)

تا کہ اللہ تعالیٰ آزمالے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔

اور کہیں اعانت و مدد کی اس دعوت کو صرف رسولوں کے ساتھ خاص فرمایا:

وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَ عَزَّرْتُمُوْھُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا (المائدہ ۵: ۱۲)

اگر تم میرے رسولوں پر ایمان لائے، اور ان کی مدد کی، اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے۔

کچھ لوگ سوچتے ہیں، ایک بندہ کو اپنے رب کا مددگار کس طرح ٹھہرایا جا سکتا ہے، یہ تو بدعقیدگی ہے۔ مگر جو محبت اور وفا کی راہوں کا آشنا ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ مسئلہ عقیدہ کا نہیں، اس میں شرک کا سوال نہیں اٹھتا۔ دعوت اس بات کی ہے کہ آدمی پوری یکسوئی، عزم اور گرم جوشی سے اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت کے لیے کھڑا ہو جائے، اور اپنے کو پورے کا پورا اس راہ میں لگا دے۔ چنانچہ اس بحث سے ہٹ کر کہ اس مقام پر اللہ کی مدد اور توقیر مراد ہے یا اس کے رسول ﷺ کی، قرآن مجید کا پیغام بالکل صاف اور واضح سنا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کرنا، یا اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کرنا، یا اس کے رسول ﷺ کی مدد کرنا ایک ہی چیز ہیں، ایک ہی دعوت کی مختلف تعبیریں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مقامات کی باہمی نسبت اس سے

بڑھ کر اور کس چیز سے واضح ہو سکتی ہے کہ یہ کہہ دیا گیا کہ، جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی (النساء۴:۸۰) اور یہ کہ ہر نقش جو اللہ کے رسول ﷺ نے چھوڑا، اس پر چلنا ہی دراصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اور اس کی محبت کے حصول کی ضمانت ہے۔ (آل عمران۳:۳۱)

اللہ کے رسول ﷺ کے کون سے نقوش پا سب سے زیادہ گہرے اور سب سے زیادہ اہم ہیں؟ سب سے اہم ہر وہ قدم ہے جو آپ ﷺ نے فریضۂ رسالت کی تکمیل کی غرض سے اٹھایا۔ ایسا ہر نقش نہ صرف سب سے اہم بلکہ مدد اور توقیر کی عملی تفسیر اور تفصیل بھی ہے۔ خواہ وہ نقش طائف کی وادیوں میں چھوڑا ہو، مکہ کی گلیوں میں، یا بدر وحنین کے میدانوں میں۔ ان نقوشِ پا پر چلنا ہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مدد اور توقیر کرنا ہے۔

اب بڑی اہم بات یہ ہے کہ یہاں مدد کی دعوت دے کر یہ بات کھول دی گئی ہے کہ اس جگہ جس ایمان کی دعوت دی جا رہی ہے وہ روایتی اعلان ایمان نہیں، وہ صرف اقرار باللسان نہیں، اس کی تکمیل زبان سے چند الفاظ ادا کر دینے سے نہیں ہو جاتی۔ بلکہ یہاں تو وہ ایمان مراد ہے جو:

عہد ہے اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کو بیچ دینے کا،
عہد ہے مکمل طور پر اپنے رب کا بن جانے کا،
عہد ہے سمع وطاعت کا،
عہد ہے عملِ صالح کا،
عہد ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نصرت کا،
عہد ہے اللہ کی راہ میں جان اور مال سے جہاد کرنے کا،
عہد ہے وفائے عہد کا،

ہدایت الٰہی کی امانت کے حوالے سے یہی وہ عہد ہے جس کو وفا کرنے کا مطالبہ اس نے بنی اسرائیل سے کیا۔ یہی وہ عہد ہے جس کو یاد رکھنے کی تاکید اس نے ہمیں فرمائی۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ (البقرۃ ۲ : ۴۰)

اے بنی اسرائیل، یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم کو عطا کی تھی۔ میرے ساتھ جو تمھارا عہد تھا، اسے تم پورا کرو، تو میرا جو عہد تمھارے ساتھ تھا، اسے میں پورا کروں گا۔

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَیۡکُمۡ وَ مِیۡثَاقَهُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِهٖۤ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا (المائدہ ۵ : ۷)

اللہ نے تم کو جو نعمت دی ہے اسے یاد رکھو، اور اس پختہ عہد و پیمان کو بھی یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا ہے، یعنی جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور مانا۔

قافلۂ راہِ حق میں شمولیت اسی عہد کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ کلمۂ شہادت کی تجدید اسی عہد کی تجدید ہے۔ یہ تجدید ہی اس بات کی علامت ہے کہ بندہ نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے اپنا میثاق تازہ کر لیا ہے، اپنا عہد پختہ کر لیا ہے۔ یہی ایمان کے معنی ہیں۔ اس ایمان کے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے، اور جو اس کے پاس مقبول ہے۔ زبان سے عہد ہو اور عمل سے بے وفائی، تو یہ ایمان نہیں۔ چنانچہ دیکھیے، ایک جگہ یوں فرمایا گیا:

بعض اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ ان سے کہہ دو تم ایمان نہیں لائے، بلکہ اتنا کہو کہ ہم مسلمان ہوئے۔ ایمان تو ابھی تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ (الحجرات ۴۹:۱۵)

مومن وہ ہیں، جو ایمان لائیں! اس اسلوبِ بیان میں جو حقیقت پوشیدہ ہے وہ کہہ کر کھول دی گئی ہے کہ جس ایمان میں شک اور تردد کا شائبہ نہ ہو، اور نہ جان اور مال سے جہاد سے گریز ہو، وہی ایمان دراصل سچّا ہے۔ ہر شخص جو اپنے اوپر مومن کا لیبل چسپاں کر لے، لازماً حقیقی معنوں میں مومن نہیں ہے۔

گویا ایمان نام ہے اپنے رب سے جڑ جانے کا، صرف اسی کا بن جانے کا، صرف اسی کا بن کر جینے کا اور صرف اسی کی خاطر مر مٹنے کا۔ یہ ایمان اپنا سب کچھ اپنے مالک کے حوالے کر

دینے کا نام ہے۔ اس عہد کو وفا کرنے کا نام جہاد ہے، اور اس وفائے عہد کا انعام جنت ہے۔ جنت کی وہ نعمتیں ہیں، جو نہ آنکھوں نے دیکھیں، نہ کانوں نے سنیں، نہ دل ان کا تصور کر سکا۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ (التوبہ ۹:۱۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اس کی راہ میں لڑتے ہیں، اور مرتے اور مارتے ہیں۔

ایمان کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت و مدد کے لیے اور اس کو غالب کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اس راہ میں کشمکش ناگزیر ہے۔ لڑنا اور مرنا، اسی کشمکش کے دو حصے ہیں۔ یہ ساری بات بالکل صاف اور واضح ہے۔ خصوصاً غزوۂ تبوک کے حوالے سے سورۂ توبہ کے اس سیاق میں تو بالکل عیاں ہے۔

اللہ کی زمین پر صرف اللہ کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے، خدائی کے سارے جھوٹے دعویداروں کو سرنگوں تو کرنا ہی ہوگا۔ یہی وہ دعوت ہے جو قرآن مجید میں ہر جگہ موجود ہے۔ اسی دعوت کے لیے قرآن اترا، رسول ﷺ آئے، اُمت مسلمہ برپا کی گئی۔ اسی کوشش کا نام جہاد ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ جہاد تو ایسا عمل ہے کہ کوئی اور عمل اس عمل کے برابر نہیں ہو سکتا، اور اس کا اجر تو اتنا عظیم ہے کہ اور کوئی اجر اتنا عظیم نہیں ہو سکتا۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَo اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ o يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ o خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌo(التوبہ۹:۱۹۔۲۲)

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے بسانے کو، اس شخص کے کام کے برابر ٹھہرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخر پر اور جس نے جہاد کیا االلہ کیا راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں، اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ اللہ کے ہاں تو انھی لوگوں کا درجہ بڑا ہے، جو ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا، وہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب انھیں اپنی رحمت اور رضا مندی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لیے ہمیشہ کے عیش کے سامان ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حرم کو آباد رکھنے اور اس کی توقیر اور پاسبانی سے کہیں بڑھ کر، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا اور اس کی مدد اور توقیر اولیٰ اور افضل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جہاد کرنے والوں کا درجہ ہی سب سے اونچا ہے، وہی کامیاب ہیں، انھی کے لیے رب کی رحمت اور رب کی خوشنودی ہے، انھی کے لیے جنتیں ہیں، انھی کے لیے ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتیں ہیں۔

اسی جہاد کی دعوت پوری اُمت کو دی گئی ہے۔ اسی دعوت پر لبیک کہہ کر ہم سب جمع ہوئے ہیں۔

اس جگہ تُوَقِّرُوْهُ (اس کی توقیر کرو) کا فقرہ اور بھی بہت کچھ بتا رہا ہے جو قابلِ توجہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی توقیر سے مراد یہ ہے کہ ایک مومن کا سارا وجود ان ﷺ کی اطاعت اور محبت اور عزت اور ان کے ساتھ والہانہ شیفتگی سے عبارت ہو۔ یہی وہ توقیر ہے کہ جس پر امت مسلمہ کا نظام قائم ہوتا ہے۔ اس توقیر کے نتیجے میں وابستگی، استحکام، مضبوطی اور ربط کی وہ صفات و کیفیات پیدا ہوتی ہیں، جن سے ایک جماعت سیسہ پلائی ہوئی دیوار اور بنیان مرصوص بن جاتی ہے۔ اگر محبت اور توقیر کے جذبہ کو نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی جماعت ریت کی دیوار بن کر رہ جاتی ہے۔ وفائے عہد کی راہ ایک ایسی جماعت کے بغیر طے نہیں ہوسکتی کہ جو بنیان مرصوص ہو۔ اس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نصرت کے لیے جیسی جماعت کی ضرورت ہے، اس کے التزام کی دعوت اسی دعوت توقیر میں آ گئی۔

دیکھیے فرمایا:

جب رسول ﷺ اس کام کی طرف بلائے جو تمھاری حیات کا ضامن ہے تو اللہ اور رسول ﷺ کی پکار پر لبیک کہو۔(الانفال ۸:۲۴)

کہیں ارشاد ہوا:

اپنے آپ کو رسول ﷺ سے آگے نہ بڑھانا...... اپنی آواز کو رسول ﷺ کی آواز کے مقابلہ میں زیادہ بلند مت کرنا۔(الحجرات ۴۹:۱۔۲)

کہیں اس طرح ہدایت دی گئی:

مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو دل سے مانیں، اور جب کسی اجتماعی کام کے لیے رسول کے ساتھ ہوں تو جب تک اس سے اجازت نے لے لیں اپنی جگہ سے نہ سرکیں...... اپنے درمیان رسولؐ کو بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھ بیٹھو...... (ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا) جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے آنکھ بچا کر چپکے سے سٹک جاتے ہیں کہ اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔(النور ۲۴:۶۲)

گویا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی ہر بات پر لبیک کہنا ضروری ہے۔سب سے بڑھ کر، ایمان و بندگی اور جماعت و جہاد کی پکار پر۔ رسول ﷺ کے نقوشِ قدم سے تجاوز ہرگز جائز نہیں، نہ اپنی رائے، اپنی پسند اور ناپسند اور اپنے مقام کو رسول ﷺ سے مقدم یا اونچا کرنا روا ہے۔ان ارشادات سے رسول اللہ ﷺ کے مقام، ان کے مرتبہ، ان کے حقوق، اور ان کے ساتھ تعلّق کی نوعیت کا واضح طور پر تعیّن ہو جاتا ہے۔ ان ارشادات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یہ تعلّق ہر زمانے میں مسلمانوں میں ہونا چاہیے، خصوصاً اس جماعت میں جو خدا کے دین کی نصرت کے عہد کو وفا کرنے کے لیے قائم ہوئی ہو۔ یہ **تُوَقِّرُوْہُ** ہی کی تفسیر ہے۔

ان ارشادات سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر چہ اب کوئی رسول نہیں ہو سکتا کہ کسی کو ان کا مرتبہ و مقام حاصل ہو، کسی کے وہ حقوق نہیں ہو سکتے جو ان کے تھے، لیکن جو اسی دعوت کے داعی

ہوں کہ جس کے داعی وہ تھے اور ایسی جماعت کے قائد ہوں کہ جیسی جماعت ان کی تھی، وہ بھی ایک درجے میں توقیر کے مستحق ہیں۔ اس توقیر کے بغیر کوئی جماعت جان دار نہیں ہوسکتی۔

ہمہ دم دعوت

آگے ارشاد فرمایا:

وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلاً (الفتح ۴۸: ۹)

اور، لگے رہو صبح و شام اسی کی تسبیح میں۔

یعنی اللہ کی۔ تسبیح کے معروف معنی تو اللہ تعالیٰ کی حمد، پاکی اور بڑائی بیان کرنا ہیں، لیکن قرآن کریم میں تسبیح کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے اصل معنی کسی کام کو مسلسل، تیز رفتاری اور انہماک کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ چنانچہ چاند، سورج اور ستاروں کے بارے میں کہا گیا، كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسین ۳۶:۴۰)، سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔

ایک اور جگہ نبی کریم ﷺ کو اس بات کی ہدایت کرنے کے بعد کہ آپ ﷺ راتوں کو کھڑے ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کریں، آپ ﷺ کے دن کے اشغال کے بارے میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ سبحًا طویلاً کا لفظ ہے (المزمل)۔ دن کی گھڑیوں میں آپ ﷺ کس کام میں مصروف رہتے تھے؟ یہ جان لیا جائے تو تسبیح کے ایک اور اہم معنی سامنے آجائیں گے۔ دن بھر آپ ﷺ فریضۂ رسالت کی ادائیگی اور دعوت الی الحق کے کام میں مشغول رہا کرتے تھے۔ گویا دعوت کا کام بھی تسبیح ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون جیسے جابر فرمانروا کے دربار کی طرف اس غرض سے روانہ ہوئے کہ اسے اس کے رب کے آگے جھک جانے اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دینے کی دعوت پیش کریں، تو انھوں نے خود اپنے فریضے کو جن الفاظ سے تعبیر کیا وہ یہ تھے کہ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا وَنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا (طٰہٰ ۲۰:۳۳،۳۴)، ہم کثرت سے تیری تسبیح کریں اور کثرت سے تیرا ذکر کریں۔

اب غور کیجیے! یہاں صبح و شام تسبیح کرنے کے معنی کیا ہیں؟ سب سے پہلے تو اس سے مراد نماز ہوگی۔ اس لیے کہ جب حکم کا صیغہ ہو تو اس کی صبح و شام تعمیل نماز کی صورت ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ معنوں کو محض نماز تک ہی محدود کر دیا جائے۔ نہ سیاق اس بات کا تقاضا کرتا ہے۔ صبح و شام کا اصل مفہوم تو تسلسل، دوام اور انہماک ہے۔ مستقل مزاجی سے ہر وقت لگے رہو۔ اس دوام اور انہماک کے پیچھے لازماً جذبۂ شوق اور دل کی لگن ہوگی۔

گویا اول تو شوق اور لگن کے ساتھ ہر وقت اللہ کا دھیان رکھو، اس کو یاد کرتے رہو، دل کو اس کا خیال لگا رہے، زبان اس کے ذکر سے تر رہے، اعضاء وہ کام کریں جو اس کو محبوب ہوں۔ ظاہر ہے کہ جس سے پوری زندگی کا عہد ہے اس کی اتنی یاد تو ہونا ہی چاہیے۔

اور ثانیاً، اسی شوق اور جذبے کے ساتھ مسلسل اپنے عہد کو پورا کرنے میں لگے رہو۔ وفائے عہد کی تڑپ سدا بہار ہو۔ دعوتِ حق کا کام ہر آن ہو، صبح و شام ہو، مسلسل ہو۔ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو رات اور دن پکارا، کھلے اور چھپے بلایا، اس طرح وفائے عہد کا سب سے بنیادی تقاضا یہ ہے کہ رات دن اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلانے کا کام جاری رہے۔

عہد وفا

اب ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح ۴۸:۱۰)

جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ کی بیعت کر رہے تھے۔

پوری سورہ الفتح واقعہ حدیبیہ کے وقت نازل ہوئی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس آیت میں جس بیعت کا ذکر ہے، سیاقِ نزول میں اس کا مطلب وہی بیعت ہے جو حدیبیہ میں لی گئی۔ یہ بیعت ''بیعتِ رضوان'' کے نام سے معروف ہے، اس لیے کہ یہ بیعت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اسی سورہ میں آگے چل کر اپنی رضا اور خوشنودی کی بشارت دی ہے (آیت ۱۸)۔

واقعہ مختصراً یوں ہے کہ نبی کریم ﷺ عمرہ کی نیت سے مکہ تشریف لے جا رہے تھے۔ حدیبیہ تک پہنچے تھے کہ قریش نے راستہ روک لیا۔ یہ عرب کے ہزاروں برس کے مسلمہ قواعد وروایات کے خلاف تھا کہ کسی کو بیت اللہ کی زیارت سے روکا جائے۔ کفار قریش کی ساری اشتعال انگیزیوں کے باوجود حضور ﷺ نے صبر وضبط کا دامن نہ چھوڑا۔ بات چیت شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے سفیر کی حیثیت سے مکہ تشریف لے گئے۔ وہاں قریش نے ان کو روک لیا۔ ادھر یہ خبر پھیل گئی کہ حضور ﷺ کے سفیر کو قتل کر ڈالا گیا۔ یہ معمولی بات نہ تھی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اپنے سارے ساتھیوں سے بیعت لی۔ انتہائی نامساعد حالات میں یہ دراصل مر مٹنے کی بیعت تھی، پیٹھ نہ دکھانے کی بیعت تھی۔ بیع کے معنی فروخت کے ہیں، یہ اپنے آپ کو فروخت کر دینے کی بیعت تھی۔ یہ وفاداری کا پکا عہد کیا گیا تھا، اور اگر وفاداری بشرط استواری ہی اصل ایمان ہوتی ہے تو یہ عہد تھا اہل ایمان کا اپنے ایمان کو وفا کرنے کا۔

اسی لیے اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ یہاں سیاق میں بیعت رضوان مراد ہے۔ لیکن خاص کو عام کرنے کے معروف قاعدہ کے مطابق، بہت سے مفسرین نے اس بیعت کو اس بیعت ایمان پر محمول کیا ہے جو ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ہر مسلمان اپنے خدا اور رسول کے ساتھ کرتا ہے، اور جس کا بیان **اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ** میں کیا گیا ہے۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ اس کے مفہوم میں یہ بیعت ایمان اور وہ عہد وفا شامل ہیں جو ایک بندۂ مومن اپنے رب اور اس کے رسول ﷺ سے کرتا ہے۔

رسول ﷺ کا مقام پھر واضح ہو گیا، اور ساری بحثوں کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔ رسول ﷺ نہ خدا ہے، نہ خدا ہو سکتا ہے۔ لیکن خدا کا فرستادہ ہونے کی حیثیت سے اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، اور اس کے ہاتھ پر بیعت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت ہے۔ عملی زندگی میں، جب کہ اللہ تعالیٰ غیب میں ہے، اس کے علاوہ اور کوئی دوسری صورت ہو ہی نہیں سکتی۔

رسول ﷺ کا مقام ہی واضح نہیں ہوا، اس عہد وفا کی عظمت واہمیّت بھی متعین ہو گئی کہ جو اللہ تعالیٰ سے عہد تخلیق، عہد زندگی اور عہد ایمان کو وفا کرنے کے لیے باندھا جاتا ہے۔

یہ بیعت کسی انسان سے نہیں ہے، اور نہ کسی جماعت سے ہے، بلکہ یہ بیعت اور یہ عہد دراصل اپنے رب، اپنے مالک اور اپنے آقا سے ہے۔ اس سے بڑھ کر اس عہد وفا کی عظمت، اس کی نزاکت، اور اس کی گراں باری کا بیان اور کس طرح ہوسکتا ہے۔

جو عہد اس ہستی سے باندھا جائے جس کی رحمتیں ہر دم شامل حال ہوں، جس کا دستِ ربوبیت ہر پہلو سے آگے بڑھ رہا ہو، جس کی عظمت و ہیبت کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو، جو حی و قیوم ہو، جو ہر جگہ اور ہر لمحے موجود ہو، جو ہر وقت ساتھ ہو، کیا اس عہد کو وفا کرنے کا شوق اور اس بارے میں ذمے داری کا احساس کسی لمحے بھی ضائع ہوسکتا ہے، سست پڑ سکتا ہے، یا پس پشت ڈالا جاسکتا ہے۔

اللہ کا ہاتھ

لیکن اب ظاہر کی آنکھیں بند کرلیں، اور دل کی آنکھیں کھول کر دیکھیں:

یَدُاللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ(الفتح ۴۸:۱۰)

ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

یہ بات کہ یہ بیعت اور یہ عہد دراصل اللہ تعالیٰ سے بیعت اور عہد ہے، مجسم ہوکر نگاہوں کے سامنے آگئی۔ خیال میں لایئے! یہ کیسی بیعت، کیسا معاہدہ اور کیسا عہد وفاداری ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا! حالانکہ وہ تجسیم سے بالا ہے۔ اس بحث میں نہ پڑیے کہ اللہ کے ہاتھ سے کیا مراد ہے، بلکہ یہ دیکھیے کہ ہم سے اور آپ سے کیا کہا جارہا ہے۔

اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے، اس کا ایک پیغام یہ ہوا کہ یہ اتنی اہم اور گراں بار ذمے داری ہے کہ اگر انسان اس کا صحیح احساس کرلے تو اس کا قلب پاش پاش ہوجائے۔ ایک پہلو سے دیکھیے تو اللہ کی کتاب ہی دراصل وہ امانت ہے جو ہمارے سپرد کی گئی ہے۔ اسی امانت کے تقاضے کو پورا کرنے کا عہد ہے جو ہم نے باندھا ہے۔ مگر یہ وہ امانت ہے جو اگر پہاڑوں پر اتاری جاتی تو وہ پاش پاش ہوجاتے۔ اب بیعت کی عظمت و رفعت اور مقام و وقعت کا صحیح احساس ہی اس راہ وفا کے لیے سب سے قیمتی اور ضروری زادِ راہ ہے۔

اس یقین کے ساتھ عہد وفا باندھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہمارے ہاتھ کے اوپر ہے، دل کو کپکپا دینے والی کیفیت کے ساتھ ساتھ، اطمینان وسکون اور لذت کا بھی بہت بڑا خزانہ ہاتھ آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہمارے ہاتھ کے اوپر ہے۔ گویا جب ہم عہد وفا باندھ رہے ہیں اور عہد کو وفا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، تو اس کا ہاتھ ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہماری دست گیری کے لیے موجود ہے، وہ ہمیں اپنی راہوں پر آگے بڑھانے کے لیے ہمارے ساتھ ہے، اس کی قوت ہماری پشت پناہ ہے۔

شہادت حق، دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کا عہد وفا کرتے ہوئے، اس سے بڑھ کر طمانیت اور لذت اور کیا ہوسکتی ہے کہ جس کا کام کر رہے ہیں وہ ہمارے ہمراہ ہے، ساتھ ہے، ہمیں اپنی نگاہوں کے سامنے رکھے ہوئے ہے۔ اس میں وفور شوق بھی ہے، آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ہے، اور دل کی حرارت اور گرمی بھی۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون کی جانب ایک انتہائی کٹھن اور خطرناک مشن پر بھیجا، تو ان الفاظ سے تسکین، سہارے اور لذت کا سامان کیا۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى (طٰهٰ ۲۰: ۴۶)

فرمایا، ڈرنا مت، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، سب کچھ سن رہا ہوں، سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔

یہی بات نبی کریم ﷺ سے یوں فرمائی گئی:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (الطور ۵۲: ۴۸)

تم اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، تم ہماری نگاہوں کے سامنے ہو۔

اور یہی بات ہم سے یوں کہی گئی، اور خاص طور پر ایمان اور انفاق کی دعوت کے سیاق میں کہی گئی، لوگوں کو انصاف پر قائم کرنے کے مشن اور لوہے کے اتارے جانے کے ذکر سے قبل کی گئی، اور اس بات کے اعلان سے پہلے کہی گئی کہ وہ آزما کر دیکھے گا کہ کون اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مدد کرتا ہے۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحدید۵۷: ۴)

اور وہ تمھارے ساتھ ہے جہاں کہیں، (جس طرح کے حالات میں)، بھی تم ہو۔

وہ ہمارا ساتھی ہے! ایسے آقا کی راہ میں چلنے، لٹنے، مٹنے کی لذت دوبالا کیوں نہ ہو جائے کہ جس کا ہاتھ ہمارے ہاتھ کے اوپر ہے، جس کی نگاہیں ہمیں داد دے رہی ہیں، ہماری کاوشوں کی ہمت افزائی کر رہی ہیں، ہمارا حوصلہ بڑھا رہی ہیں!

دل کی سچّائی اور عہد کی پاس داری اور شرافت و جواں مردی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی جان، اپنا مال، اپنا وقت اور اپنی ساری صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی نذر کر دیں اور ایمان لانے کے بعد یہ ہماری رہیں کہاں؟ پھر جب تک جسم و جان کا یہ سودا نقد نہ چکا سکیں، اس وقت تک دل میں انتظار، شوق اور آرزو کی آگ سلگتی رہے، کہ وہ لمحہ کب آئے گا جب ساری متاعِ ہستی نثارِ قدم یار کر سکیں گے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلاً (الاحزاب ۳۳: ۲۳)

ایمان والوں میں ایسے لوگ ہیں کہ جنھوں نے سچ کر دکھلایا جس بات کا عہد کیا تھا اللہ سے۔ پھر ان میں کوئی تو اپنی نذر پوری کر چکا، اور ان میں کوئی وقت آنے کا منتظر ہے، انھوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

اب سوچیے! کتنی بڑی قساوت قلب موجود ہوگی اس شخص میں جو اپنے ایسے آقا سے بھی اپنا عہدِ وفا، ایفا نہ کرے، بلکہ الٹا عہد شکنی کی راہ پر نکل پڑے، اور اس کا وبال کیا ہونا چاہیے، اس کا خمیازہ کس کو اور کس طرح بھگتنا چاہیے۔

عہد شکنی اور بے وفائی

چنانچہ ارشاد فرمایا اور متنبہ کیا:

فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ. (الفتح ۴۸: ۱۰)

اب جو شخص اس عہد کو توڑ دے تو اس کے عہد توڑنے کا وبال اسی پر پڑے گا۔

نقصان وہ کسی کا نہ کرے گا، نہ اللہ کا، نہ رسول ﷺ کا، نہ جماعت کا، بلکہ اپنا اور صرف اپنا۔ جو برائی بھی آدمی کماتا ہے اس کا بوجھ اپنے اوپر ہی لادتا ہے۔ جس نے اپنے عہد کو وفا نہ کیا، نہ وفائے عہد کا انتظار کیا، نہ اس کے لیے شوق رکھا، بلکہ کوئی اور ہی راہ اختیار کی، یا اس عہد پر کچھ دوسری ہی چیزوں کو ترجیح دینا شروع کر دی، تو یہ ساری کمائی اس کے اپنے نقصان کی کمائی ہے۔ **ومن یکسب اثما فانما یکسبہ علٰی نفسہ**، جو برائی کماتا ہے تو اس کی یہ کمائی اسی کے لیے وبال ہوگی۔ انسان محنت کرے اور اپنے گھاٹے کا سودہ کرے، اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔

اس عہد شکنی کے نتائج دنیا میں ذلت، رسوائی اور مغلوبیت ہیں، اور آخرت میں عذاب شدید۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ اس بارے میں کیا ارشاد فرماتا ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو لوگ بے وفائی کرتے ہیں، اپنا عہد توڑتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو سخت کر دیتا ہے، پتھر کی طرح بنا دیتا ہے، اور ان پر لعنت کرتا ہے۔ دلوں کی سختی اور لعنت، یہ دو سزائیں تو سر کی آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہیں۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً (المائدہ ۵: ۱۳)

یہ ان کا اپنا عہد توڑ ڈالنا تھا، جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیے۔

لعنت کیوں؟

یہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی امانت، وحی اور کتاب کی امانت، بہت بڑی امانت ہے، عظیم ترین امانت ہے۔ اس کتاب کا حق ادا نہ کرنا، اس کو انسانوں تک نہ پہنچانا، اس کے مطابق انسانی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش نہ کرنا، ایک بہت بڑی خیانت ہے، اور ایک بدترین جرم ہے۔ اس کتاب کا حق ادا کرنا ہی اصل وفاداری ہے، سب سے بڑی ذمے داری ہے۔ یہ ذمے داری سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا حق ہے جس نے یہ کتاب عطا فرمائی۔ یہ فرشتوں کا حق ہے کہ وہ یہ

ہدایت لے کر آئے۔ یہ رسولوں کا حق ہے کہ انھوں نے دعوتِ حق پہنچائی۔ اور یہ ان سارے انسانوں کا حق ہے جو دنیا اور آخرت کے خسران کا شکار ہونے والے ہیں اور آگ میں گرنے والے ہیں، صرف کتاب اللہ کی امانت کے پاسبانوں کی بے وفائی اور کوتاہی کی وجہ سے۔

یہ بے وفائی، عہد شکنی، کوتاہی، جس سے ہر حق والے کے حق کی خلاف ورزی ہوتی ہے، کتاب اللہ کے حاملین کو لعنت کا مستحق بناتی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ o اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ o اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ o

(البقرۃ ۲:۱۵۹-۱۶۱)

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآں حالیکہ ہم نے انھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے، یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرتا ہے، اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ البتہ جو اس روش سے باز آجائیں، اور اپنے طرزِعمل کی اصلاح کر لیں، اور جو کچھ چھپاتے تھے بیان کرنے لگیں، ان کو میں معاف کر دوں گا، اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا، اور کفر کی حالت میں ہی جان دی، ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔

لعنت کیا ہے؟

ہماری ساری زندگی رحمتِ الٰہی کی محتاج ہے، اور جب رحمت ہٹا لی جائے تو پھر کیا باقی رہ جاتا ہے؟ ذلت اور مسکنت ہو، افتراق اور انتشار ہو، باہمی خون ریزی اور فساد ہو، بُغض اور عداوت ہو، اخلاقی زوال اور ظلم ہو، غیر قوموں کا تسلط اور ان کی غلامی ہو، ان کی طرف سے

آبادیوں کی تاخت و تاراج ہو، یہ سب لعنت ہی کے مظاہر تو ہیں۔

قساوتِ قلوب؟

اس سے بڑھ کر دل کی سختی اور کیا ہوگی کہ لاکھوں وعظ کہے جاتے ہیں اور بے اثر رہتے ہیں، قرآن کی تلاوت کثرت سے ہوتی ہے اور صبح و شام اس کا درس ہوتا ہے، مگر نہ دل پگھلتے ہیں، نہ آنکھیں نم ہوتی ہیں، نہ عملی حالت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ سحر طراز ادیب، شیریں بیان واعظ، عابد و زاہد، صوفی اور جلیل القدر علما سب ہی بے اثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ پتھروں میں بھی کوئی ایسا ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں، کوئی ایسا کہ پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے، اور کوئی ایسا کہ خدا کے خوف سے لرز کر گر پڑتا ہے۔ لیکن جب انسانوں کے دل سخت ہوتے ہیں تو وہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں ...... نہ نرم پڑتے ہیں، نہ جھکتے ہیں۔

بے وفائی

عہد شکنی اور بے وفائی، ہرجائی پن اور غیروں سے آشنائی، عہد وفا سے روگردانی......بس یہی جڑ ہے ہر چیز کی۔ ہر مصیبت سزا ہے اسی جرم کی۔ پوری اُمت اس سزا میں شریک ہے۔ پھر اگر چند مخصوص افراد اور کوئی مخصوص جماعت وفائے عہد کا عزم کرنے کے باوجود عہد وفا کو پس پشت ڈالنا شروع کر دے تو کیا وہ اپنے گناہ کا خمیازہ بھگتنے سے بچ سکتی ہے؟ آج اپنے ہاں درس و تقریر اور وعظ و نصیحت کی فراوانی دیکھیے، اور اثر پذیری و عمل کی کمیابی پر نگاہ ڈالیے! آخر ایسا کیوں ہے؟

بے وفائی کا اصل سبب

یہ اپنے عہد وفا سے لاپروائی اور تغافل کا معاملہ، یہ بے وفائی اور عہد شکنی، یہ سب ہم کیوں کرتے ہیں؟ وفائے عہد کا وزن ترجیحات کی میزان میں کیوں کم ہوتا چلا جاتا ہے؟ اس کی وجوہات بہت ساری ہیں۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ صورت حال اس وقت پیدا ہونا شروع ہوتی ہے۔ جب ہماری نگاہیں اصل نصب العین سے ہٹنا شروع ہو جائیں، اور دوسرے

مقاصد ہماری توجہات کا مرکز ومحور بنتے چلے جائیں۔

ان دوسرے مقاصد میں سب سے بڑی چیز متاعِ دنیا ہے، حیات دنیا کا ساز وسامان ہے۔ جو یکسوئی کے ساتھ آخرت کا نہ ہو جائے وہ راہِ وفا ہرگز طے نہیں کرسکتا۔ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں جب بھی راہ وفا میں لغزشیں ہوئیں، تو قرآن مجید نے اسی مرض کی نشاندہی کی۔ جب ہدایت کی، تو آخرت کے لیے یکسو ہو کر عزم وارادہ اور سعی وجہد کی ہدایت کی۔ ٹوکا اور روکا، تو نگاہوں کے بھٹکنے سے روکا کہ دنیا کو مقصودِ نظر نہ بنائیں۔ فرمایا:

لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡکَ اِلٰی مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ (الحجر ۱۵:۸۸)

تم اس متاع دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو، جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے۔

جب نگاہ بہک کر متاع دنیا میں اٹک جاتی ہے تو دل پھسلتا ہے، جب دل پھسلتا ہے تو قرار وفا کہاں ٹھہرے اور کیسے ٹھہرے...... پھر صراطِ مستقیم چھوٹ جاتی ہے اور راہ وفا کھوٹی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس آیت کی تفسیر معلوم کرنا ہو تو سر کی آنکھوں سے دیکھیے، اپنے چاروں طرف دیکھیے، اپنا معاشرہ دیکھیے اور سب سے بڑھ کر خود اپنے آپ کو دیکھیے۔

اس کا علاج کیا ہے؟

اس اجر پر یقین کہ جو غیب میں عہد وفا کو وفا کرنے والے کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ نگاہیں اسی پر جمی رہیں، دل اسی کی طلب میں مضطرب اور بے چین رہیں۔

اس لیے اب وفائے عہد کا بیان ہوتا ہے۔

اجر وفا

فرمایا:

وَمَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیۡهُ اللّٰهَ فَسَیُؤۡتِیۡهِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا. (الفتح ۴۸:۱۰)

اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے، تو اللہ جلد بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

یہ اجر عظم کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف اجر عظیم کہنا ہی کافی ہے۔ جو اللہ کے پاس ہے وہی سب سے بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ لیکن جو اجر عظیم وفائے عہد کے بعد اس سے ملاقات کے وقت ملنے والا ہے، اس کی تفصیلات کو جس طرح اللہ تعالیٰ نے خود بیان کیا ہے، اس کے پیش نظر لذت بیان کی خاطر ہی کچھ کہنے کو دل چاہتا ہے۔ اس وقت موقع کہاں، بس چند باتیں ہی کہی جا سکتی ہیں۔

سب سے بڑھ کر اس کی رضا اور توجہ ہے۔ ہر چیز فانی ہے، ہلاک ہونے والی ہے، سوائے اس کے وجہ کریم اور ذوالجلال والاکرام کے۔ پھر وہاں وہ سب کچھ ہے، جس کو آپ کا دل چاہے۔ لَهُمْ مَّا يَشَآؤُنَ فِيْهَا اور اس سے زائد بھی بہت کچھ، خاص اس کی طرف سے جس کی قدرت وعطا بے حد وحساب ہے۔ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۔(ق ۵۰ : ۳۵)

اس کا یہ وعدہ تو ازل سے چلا آ رہا ہے، ابد تک رہے گا۔ پس خوشیاں منائیں جو عہد وفا، وفا کریں۔

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝(التوبۃ۹:۱۱۱)

ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے، تورات اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے! یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اتنے عظیم اجر کے وعدہ کے بعد بھی اگر قدم راہ وفا سے بھٹک جائیں اور نگاہیں بہک کر دنیا میں اٹک جائیں، تو واحسرتا کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ اجر عظیم کا وعدہ صرف آخرت میں ہی نہیں ہے، دنیا میں بھی ہے۔

نصرت اور فتح کی بشارت ہے۔

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ (الصف ۶۱:۱۳)

اور وہ دوسری چیز جو تمھیں محبوب ہے، وہ بھی تمھیں دے گا، اللہ کی طرف سے نصرت اور

جلد ہی حاصل ہونے والی فتح۔

خلافت کا وعدہ ہے، دین کے غلبے کا عدہ ہے، امن وسلامتی کا وعدہ ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۠ يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا ۠ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَo(النور ۲۴ : ۵۵)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، ان کے لیے ان کے دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرے گا جسے اس نے ان کے حق میں پسند کیا ہے، اوران کی حالت خوف کو امن سے بدل دے گا۔

زمین میں علو وغلبہ کا وعدہ ہے:

وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ كُنْتُمْ مُّوْمِنِيْنَ (آل عمران ۳:۱۳۹)

تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔

ساری برکتوں کے زمین سے ابلنے اور آسمانوں سے برسنے کا وعدہ ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرضِ (الاعراف ۷:۹۶)

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

سب سے بڑھ کر یہ وعدہ کہ تمھیں خدا کا ساتھ نصیب ہوگا۔

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُم بِرُسُلِىْ وَعَزَّرْ تُمُوْهُمْ (المائدة ۵:۱۲)

اور اللہ نے فرمایا میں تمھارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں کو مانا، اور ان کی مدد کی۔

اور اس سے بڑھ کر بشارت ایک مردمومن کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب وہ اس دنیا میں اپنے رب کی راہ میں جہاد کر رہا ہے، اس کا کلمہ بلند کر رہا ہے، گردوپیش کے لوگوں کو پکار رہا ہے، تو ایسے عالم میں ہر آن اور ہر گام اس کا رب اس کا رفیق ہے۔

ان سارے وعدوں کا جامع یہ ہے کہ تم نے وفائے عہد کی تو میں بھی اپنا ہر عہد وفا کروں گا۔

اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ اُوْفِ بِعَهْدِ كُمْ (البقرہ ۲:۴۰)

تم مجھ سے عہد وفا کرو، میں تم سے عہد وفا کروں گا۔

❖❖❖

حرفِ آخر

قرآن مجید کے اس مختصر سے حصّے میں ہمارا ہی ذکر ہے، ہمارا ہی بیان ہے، ہم ہی مخاطب ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا قافلہ وہ ہے کہ جس کا وجود احساس عہد وفا ہی کا نتیجہ ہے، جس کا مقصود وفائے عہد ہی ہے، جس نے وفاداری بشرط استواری ہی کو ایمان کا حاصل سمجھا اور مانا ہے۔

ہم نے اپنا سفر اس عزم کے ساتھ شروع کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر بندے تک، ایک ایک عورت مرد اور بچے تک، اللہ تعالیٰ کی بندگی کا پیغام پہنچا دیں گے، ان کو نفاق و تناقض اور بے وفائی اور نقض میثاق کی دلدل سے نکالنے کی جدوجہد کریں گے، ان کو حق کا گواہ بنا کر کھڑا کریں گے، اور اس راہ میں اپنا مال، اپنی جان، اپنا وقت، سب لگا دیں گے، کھپا دیں گے، یہاں تک کہ زندگی کا ایک ہی قبلہ رہ جائے گا، زندگی کا ایک ہی مقصود ہوگا، اور ہر دلچسپی پر ایک ہی دلچسپی غالب ہوگی۔ اس چیز کو ہم نے اپنے ہاں کاغذ اور دلوں پر ان الفاظ میں رقم کر رکھا ہے۔

ہم اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو اقامت دین کے نصب العین پر مرکوز کر دیں گے، اور اپنی حقیقی ضرورتوں کے علاوہ ان تمام دلچسپیوں سے دست کش ہو جائیں گے جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں۔

یہ وہ منزل ہے جس پر ہمارا عہد پورا ہو جائے گا۔ خواہ راہِ وفا پر ہمارا قدم پہلا قدم ہو یا آخری، خواہ دنیا میں ہماری آنکھیں فتح کے نظارے سے ٹھنڈی ہوں یا نہ ہوں، جب تک وفائے عہد کی منزل سر نہ ہوگی اللہ تعالیٰ کی نصرت ہمارے ساتھ نہ ہوگی۔

یہ میزان آپ کے ہاتھ میں ہے، اس پر اپنے آپ کو تول لیجیے۔ دنیا میں نتائج مطلوب نہ پانے اور نہ ملنے کے جتنے سوالات ہیں، ان کا جواب بھی اِسی میزان سے حاصل کر لیجیے۔ آخرت میں جو کچھ آنے والا ہے وہ بھی یہی میزان آپ کو بتا دے گی۔

انابت و رجوع کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔

❖❖❖